بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حال میں حکومتِ مغربی پاکستان کے ایک محترم وزیر صاحب نے یہ ارشاد فرمایا:

"معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے والدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس امر کا اطمینان کریں کہ ان کے گھروں اور ماحول میں صحیح اسلامی اقدار اور روایات کا احترام ہوتا ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ نئی پود کو مذہب کے قریب تر لایا جائے اور ان میں اسلام کی سچی محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ مذہب کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ حکومت اس امر کی خواہش مند ہے کہ ہمارے نوجوان مثالی کردار کے حامل بنیں تاکہ ہماری قوم کو اقوامِ عالم کی نظروں میں عزت و توقیر کا مقام حاصل ہو۔ . . . ہماری تمام مشکلات اور معاشرتی خرابیوں کا حل اسلامی اصولوں اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات و اقوال پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح اس میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔"

کتنی صحیح ہے یہ نصیحت اور کس خوبصورت انداز میں محترم وزیر صاحب کی زبان سے یہ ادا ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ وزیر صاحب کی اسلام سے گہری وابستگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ صاحبِ موصوف اسلام ہی کو ایک صحیح نظامِ حیات سمجھتے ہیں۔ اُس کے اخلاقی ضابطوں کی پابندی میں اپنی اور اپنی قوم کی فلاح و کامرانی پاتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اُن کے نزدیک مشعل راہ

ہیں اور اس کی روشنی میں وہ اپنا سفرِ حیات طے کرنے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں لیکن کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ انہی پاکیزہ خیالات کا پرچار کرنے والے اور اسلام کی تعلیمات میں اپنی اور قوم کی فلاح ڈھونڈنے والے وزیر صاحب کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس میں ایک نوجوان مغنیہ سازندوں کے جھرمٹ میں بیٹھی مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے ارکان کے سامنے اپنے فن کا کمال دکھا رہی ہے، اور تصویر کے تعارف سے معلوم ہوا کہ یہ محفل خود انہی وزیر صاحب نے اسمبلی کے رفقاءِ کار کی میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے ترتیب دی تھی۔

ہماری عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ وزیر صاحب چنگ و رباب کے بارے میں حضور سرورِ کائنات کے ارشادات سے ناواقف ہونگے۔ یا انہیں گانے بجانے والیوں کے نغموں سے لطف اندوز ہونے کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر معلوم نہ ہوگا۔ یا وہ ان حدبندیوں سے بے خبر ہونگے جو دینِ حق نے حسن و نظر کے درمیان قائم کر رکھی ہیں۔ وہ مسلم معاشرے کے ہی ایک معزز رکن ہیں۔ اس معاشرے کے عام احساسات اور اس کے اجتماعی ضمیر سے آخر وہ اتنے بے تعلق یا غافل کیسے ہو سکتے ہیں کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ اسلام عیش و عشرت کی ان محفلوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مسلم تو ایک طرف رہے غیر مسلم تک جانتے ہیں کہ سفلی جذبات کو بھڑکانے والے اس آرٹ کی ہر نوع کا اسلام شدید ترین دشمن ہے۔ وہ رنگ و آہنگ کی ہمت افزائی کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اسے دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے۔ وہ انسانی دل و دماغ پر اس کے اثرات کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کانوں کے راستے جسم کے اندر سرایت کرنے والی اس "شراب" کو انسانی اخلاق کے لیے اتنا ہی مضر سمجھتا ہے جتنا کہ حلق کے راستے جانے والی دخترِ رز کو۔

وزیر صاحب نے اس دعوت کا اہتمام یقیناً کسی مجبوری کے تحت تو نہیں کیا ہوگا۔

انہوں نے محض اپنی اور اپنے دوستوں کی تسکینِ ذوق ہی کے لیے یہ بزم سجائی ہوگی۔ اسلام سے ان کی گہری عقیدت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس نوعیت کی محفل آرائی کو دیکھتے ہیں تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ اُن کے قول و فعل کے اس تضاد کی کونسی توجیہ کر کے اپنے دل کو مطمئن کریں۔ اگر وزیر صاحب اپنے قلب کی گہرائیوں میں واقعی اسلام کو ہی صحیح نظامِ حیات سمجھتے ہیں اور اس کی پیروی ہی میں اپنی اور اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کی نجات دیکھتے ہیں تو پھر راگ و رنگ کی محفلیں خود منعقد کرنا کیسا، انہیں تو ایسی برائیوں کے خاتمہ کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اگر وہ دل و جان سے طاؤس و رباب کی افادیت کے قائل ہیں اور بے حجاب خواتین کے نغموں کو معاشرے کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے ہیں تو پھر ان کا لوگوں سے یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی اختیار کریں۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا دم بھی بھرے اور ان کی پیروی کو ہی دنیا اور آخرت کی بھلائی کا ذریعہ تسلیم کرے، لیکن دوسری طرف پورے ذوق و شوق سے اپنی سرپرستی میں ایسی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام بھی کرے جو حضور سرورِ کائنات کے ارشادات کی عین ضد ہوں۔

قول و فعل کا یہی تضاد ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے جس نے اندر ہی اندر سے ہمیں بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلام ہمارے لیے اب کوئی رہنما اصول یا قوتِ فکر و عمل یا مشعلِ راہ نہیں رہا بلکہ اس کی حیثیت اب ہمارے نزدیک ایک سستے نعرے کی سی ہے جس سے یا تو ہم گرمیٔ محفل کا سامان کر لیتے ہیں یا پھر اپنی قیادت کی دکان چمکانے کا کام لیتے ہیں۔ یہ کوئی نصب العین، مقصدِ حیات یا ہماری غایت الغایات نہیں بلکہ ایک مفید ہتھیار ہے جس سے آڑے وقت میں ہم اپنے تختِ اقتدار کی حفاظت و پاسبانی کرنے میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے محبت و عقیدت کے نہایت بلند بانگ دعووں کے باوجود اپنی عملی زندگی میں ہم اسے کسی طرح بھی اثرانداز نہیں ہونے دیتے اور عمل کے

میدان میں انہیں اقدارِ حیات سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں جن کا مغرب پرستار ہے۔

کسی مقصد سے سچی لگن اور کسی نصب العین سے مخلصانہ وابستگی کا صرف ایک ہی معیار ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ہم اُس کے حصول کے لیے کس قدر ایثار اور قربانی کر سکتے ہیں اور اپنے ذاتی آرام و آسائش کو اُس کے لیے کس حد تک تیاگ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ ایک شخص کے دل میں کسی مقصد کے ساتھ جتنا زیادہ عشق ہوگا اتنا ہی وہ اس کے لیے اپنا وقت، اپنی جان، اپنا مال، اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں، اپنی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ اگر کوئی فرد یہ کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کا فلاں مقصد رکھتا ہوں لیکن اُس کے حصول کے لیے اپنے کسی مفاد کو نظر انداز کرنے کے لیے کمربستہ نہیں ہوتا، تو وہ اپنے عمل سے اپنے قول کی تردید کر دیتا ہے۔ نصب العین سے محبت واقعی ایک قلبی کیفیت کا نام ہے۔ لیکن یہ کیفیت کوئی ایسی چیز نہیں جو محض سینے کا ایک سربستہ راز ہو۔ بلکہ یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو عملی زندگی کی مہمات سے لیکر اُس کی معمولی سے معمولی جزئیات تک میں پوری طرح جھلکتا ہے۔ انسانی نفسیات نے کسی شخص کے قول کو جانچنے کے لیے ہمیں جو معیارات دیئے ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جتنا کوئی عمل غیر ارادی ہوگا اتنا ہی وہ اُس کی قلبی کیفیات کا بہتر شارح اور ترجمان ہوگا۔ چنانچہ اخبارات کی عام اور معمولی خبروں کو دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام اور اُس کی تعلیمات پر کتنا یقین رکھتا ہے۔ یہ آرٹ کونسلوں کی دل و جان سے سرپرستی، مخلوط تعلیم کی ہمت افزائی، رقص و سرود کے ذریعہ اپنے کلچر کی دوسرے ممالک میں نمائندگی، سُودی کاروبار کا روز افزوں فروغ اور اس کے لیے نت نئے منصوبے اور اسلام کے اوامر و نواہی کی کھلے بندوں تضحیک، سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ قوم کو اسلام کے قریب لانے کے بجائے ایک بگے بندھے پروگرام کے تحت اس سے دُور لے جایا جا رہا ہے اور اسلام کے حق میں مختلف مواقع پر مدح و ستائش کے کلمات محض تکلفات ہیں جن سے عوام کو

بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ جس نصب العین سے انحراف کے لیے ہم مسلسل تگ و دو کرتے رہیں، اس کا صرف وقتاً فوقتاً نام لینے سے تو اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی نسخہ اسی صورت میں کارگر ہوتا ہے جب اسے پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ استعمال کیا جائے اور ان تمام چیزوں سے پرہیز اور احتیاط کو عملاً ملحوظِ خاطر رکھا جائے جو اس کے موثر اور نتیجہ خیز ہونے میں مانع ہوں۔

یہ حقیقت گو بڑی تلخ ہے لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات پر سے یقین اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ سے اس کی عظیم صداقت اور غیر معمولی عظمت کے نقوش آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ ہم زبان سے بلاشبہ اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہمارے سارے دکھوں کا مداوا اور ہمارے سارے مسائل کا واحد حل ہے، لیکن دل کی گہرائیوں سے اس عظیم حقیقت کو ــــ اس حقیقت کو جس پر یہ پوری کائنات گواہ ہے ــــ تسلیم نہیں کرتے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم کسی شے کو اپنے حق میں تریاق بھی سمجھیں لیکن زہر کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور اس کی جگہ ان نسخوں کو آزمائیں جنہوں نے ہماری زندگی کے ہر حصے کو زہر آلود کر کے اسے بالکل مفلوج بنا رکھا ہے۔

اسلام کے معاملے میں ہمارے اس منافقانہ طرزِ عمل کو سمجھنے کے لیے مشاہدہ کی کوئی شدید ریاضت یا عقل کی کوئی غیر معمولی مقدار درکار نہیں۔ ہمارے ملک کے روزمرہ کے واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ شراب کے متعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بالکل واضح ہیں۔ اس کی حرمت کے بارے میں امت کے کسی گروہ نے کسی وقت بھی اختلاف نہیں کیا۔ پھر یہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ بھی نہیں جو ہمارے حکام عالی مقام کی سمجھ میں نہ آتا ہو۔ اور شراب انسانی زندگی کی کوئی بنیادی ضرورت بھی نہیں جس کے بغیر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گاڑی نہ چل سکتی ہو۔ مغربی اقوام جو اس کی بڑی رسیا ہیں وہ بھی اسے ضرر رساں تعیش (HARMFUL LUXURY) کی

فہرست میں شامل کرتی ہیں۔ ایسی بیکار اور حرام شے کا، جو صحت اور اخلاق دونوں کے لیے تباہ کن ہے، پاکستان میں چلن ممکن نہ تھا اور اس امر کی بجا طور پر توقع تھی کہ اس ملک کے ارباب اختیار، جو اسلام سے محبت اور عقیدت کے دعویدار ہیں، اہل پاکستان کو اس لعنت سے نجات دلانے کی پوری کوشش کریں گے لیکن صوبائی اور قومی اسمبلی کی کارروائیوں کی جو روداد یں ابھی حال ہی میں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس حرام شے کے استعمال میں چند سالوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

وزیر صنعت مسٹر الطاف حسین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق گزشتہ پانچ سے سات سال کی مدت میں شراب کی تیاری اور استعمال میں کم و بیش دگنا اضافہ ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یعنی مارشل لا کے نفاذ کے وقت پاکستان میں کل ۶۵ ہزار ۰۹۰ گیلن دیسی شراب تیار ہوتی تھی۔ ۱۹۶۴ء تک یہ مقدار بڑھ کر ایک لاکھ ۴۳ ہزار ۷۵۲ گیلن ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں ولایتی قسم کی جو شراب پاکستان میں تیار ہوتی تھی اس کی مقدار ۵۱ ہزار ۸۲۲ گیلن تھی۔ ۱۹۶۴ء میں یہ بڑھ کر ۸۷ ہزار ۹۳۷ گیلن تک پہنچ گئی۔ وزیر صنعت نے اسی ضمن میں یہ بھی بتایا کہ ۱۹۵۸ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک ۶ سال کے اندر اس ملک میں ۳۶ لاکھ گیلن سے زائد شراب تیار کی گئی ہے جس میں ۲۴ لاکھ گیلن سے زائد بیئر بھی شامل ہے۔ انہوں نے اس امر کا انکشاف بھی کیا کہ ۶۱-۱۹۶۰ء سے لے کر ۶۵-۱۹۶۴ء تک پانچ سال کے اندر اس خطۂ پاک میں ۲۳ لاکھ گیلن سے زائد شراب استعمال کی گئی ہے جس میں سے مشرقی پاکستان میں صرف پانچ لاکھ ۴۲ ہزار ۱۳۵ گیلن شراب استعمال ہوئی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اہل پاکستان کو اس بات سے بھی مطلع فرمایا ہے کہ مغربی پاکستان نہ صرف اس اُمّ الخبائث کے استعمال میں مشرقی پاکستان پر سبقت لے گیا ہے بلکہ اس ام الخبائث کے تیار کرنے میں بھی وہ مشرقی بازو کی نسبت غیر معمولی فوقیت رکھتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں شراب بنانے کا صرف ایک کارخانہ ہے اور مغربی پاکستان میں ان کارخانوں کی تعداد چار ہے۔

پھر ذرا اس بات کو بھی نگاہ میں رکھیے کہ ملک و قوم کی بھلائی چاہنے والے وہ اربابِ اختیار جو پاکستان کے معاشی استحکام کے لیے اتنے فکرمند ہیں کہ انہوں نے زرِ مبادلہ کی بچت کے لیے حج جیسے اہم دینی فریضہ پر پابندی لگا رکھی ہے، اس حرام شئے کی درآمد کے معاملے میں ان کو زرِ مبادلہ بچانے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ۲۶ جون کو مرکزی حکومت کے پارلیمانی سیکرٹری جناب نورالحق چودھری نے غیر ملکی شراب کی درآمد کا جو گوشوارہ قومی اسمبلی میں پیش کیا ہے اُسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں اس مد پر ۱۰ لاکھ ۳۹ ہزار کا زرِ مبادلہ صرف ہوا تھا اور اس کے بعد اس میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ مقدار ۳۱ لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ ۱۹۶۲ء میں یہ ۳۳ لاکھ ۷۷ ہزار ہوگئی۔ ۱۹۶۳ء میں یہ اور بڑھی اور ۴۰ لاکھ ۸۷ ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۴ء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوا اور یہ بڑھ کر ۵۴ لاکھ ۹۷ ہزار تک جا پہنچی۔ اس طرح صرف پانچ سالوں میں، جبکہ پورے ملک میں صرف ایک شخص کو بلاشرکتِ غیر حکمرانی کے تمام اختیارات حاصل تھے اور جو یہاں کے سیاہ و سپید کا پوری طرح مالک تھا، اس خطۂ ارضی میں اس حرام شئے کی درآمد پر ایک کروڑ ۷۱ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ کا زرِ مبادلہ صرف کر ڈالا گیا۔ جس رفتار سے ہر سال اس رقم میں اضافہ ہوتا رہا ہے اُسے سامنے رکھا جائے تو بعید نہیں کہ اس مالی سال میں کم از کم ستّر پچھتّر لاکھ روپے کا زرِ مبادلہ اس مد پر صرف ہوا ہو۔ اس رقم کو بھی اگر شامل کر لیا جاتے تو صرف پچھلے پانچ سالوں میں یعنی ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک غیر ملکی شراب کی صرف درآمد پر ڈھائی کروڑ روپیہ کا زرِ مبادلہ برباد ہوا ہے۔ معاشی اعتبار سے یہ کتنا عظیم نقصان ہے اس کا اندازہ مرکزی وزیرِ تجارت جناب غلام فاروق صاحب کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے چار کروڑ کی رقم سے پٹ سن کا ایک اتنا وسیع کارخانہ قائم کیا جا سکتا ہے جس سے کم از کم بیس ہزار افراد کو براہِ راست یا بالواسطہ روزگار مہیا ہو سکتا ہے۔

اس تصویر کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ صوبائی وزیر آبکاری کے دیئے ہوئے اعداد و شمار

کی رُو سے مغربی پاکستان میں اِس وقت ۴۶۳ دوکاندار شراب فروشی کے باقاعدہ لائسنس یافتہ ہیں اور ان میں سے پُورے ۲۵۷ مسلمان ہیں۔ افیون فروشی کے لائسنس یافتہ دوکانداروں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں مسلمان ۳۰۲ ہیں اور غیر مسلم صرف ۱۴۔ کیا مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان بنانے کا مطالبہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ ہم اِن گناہوں میں اپنی اکثریت کی شان دکھائیں؟

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مغربی پاکستان میں سرکاری اعداد و شمار کی رُو سے اُن لوگوں کی تعداد ۵۳۷۶ ہے جن کو شراب نوشی کے باقاعدہ پرمٹ ملے ہوتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو جانے دیجیے کہ مسلمانوں کو شراب نوشی کے پرمٹ دینا ایک مسلمان ملک کی حکومت کو کہاں تک زیبا ہے۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ۴۶۳ شراب فروشوں کا کاروبار صرف ۵۳۷۶ گاہکوں کے بل پر چل سکتا ہے؟ حساب سے تو فی دوکاندار پُورے ۱۲ گاہک بھی نہیں پڑتے۔ لامحالہ پرمٹ کے بغیر شراب پینے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، ورنہ اتنے شراب فروش اپنی تجارت ہرگز نہیں چلا سکتے۔

مرکزی اور صوبائی اسمبلی میں اس موضوع پر اربابِ حکومت نے جو تقریریں کی ہیں وہ ذہنی انتشار کی بڑے کھلے طور پر غمازی کرتی ہیں۔ اُن کے پڑھنے سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اصحابِ اقتدار اس خبیث شے سے اتنے ہی متنفر اور بیزار ہیں جتنا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے اور وہ اسے ختم کرنے کے دل و جان سے آرزومند ہیں، مگر بےچارے محض غیر ملکی ماہرین کے جذبات کا احترام کرتے ہوتے اسے گوارا کر رہے ہیں۔ انہیں خدشہ لاحق ہے کہ اگر انھوں نے اس پر پوری طرح پابندی عائد کر دی تو یہ غیر ملکی لوگ ناراض ہو کر فوراً ملک سے بھاگ جائیں گے اور اس طرح ہماری تعمیر و ترقی کے مختلف منصوبوں کی تکمیل مشکل ہو جائے گی اور ان کے جانے سے ملکی سلکھ اور اس کی معیشت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ ہم اس اندازِ فکر کو بنیادی طور پر اسلام کے

منافی سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم صرف خالق کی خوشنودی کا خیال رکھو اور اُس کی خوشنودی پر کسی دوسرے کی خوشنودی کو ترجیح نہ دو۔ لیکن ہمارے وزراء کرام اسمبلی کے اندر معزز ارکان کے سامنے اس بات کا برملا اعتراف کر رہے ہیں کہ اُن کے نزدیک غیر ملکی ماہرینِ فن کی ناراضی خداوند تعالیٰ کی ناراضی سے کہیں زیادہ اہم ہے اور خدا خواہ ناراض ہو جائے لیکن وہ "ان جھوٹے خداؤں" کی ناراضی مول لینے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کے اس طرزِ استدلال کی حقائق اور واقعات پوری طرح تکذیب کرتے ہیں۔ اگر وہ فی الحقیقت اس خبیث شے کو محض غیر ملکی ماہرین کی وجہ سے انتہائی مجبوری کے عالم میں برداشت کر رہے ہیں تو پھر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر پاکستان کے مسلم باشندوں کو اس کی خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی جاتی ہے۔ اس حرام چیز کے استعمال اور اس کے کاروبار سے حتی الوسع مسلم آبادی کو تو پوری طرح بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن یہاں عملاً ہو کیا رہا ہے۔ حکومت مسلمانوں کو خود شراب نوشی کے پرمٹ اور اس کی فروخت کے لیے لائسنس عطا کرتی ہے جیسا کہ اسی کے دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا حکومت کی طرف سے عطا کردہ یہ اجازت نامے اور لائسنس اس بات کی کھلی دلیل نہیں ہیں کہ یہاں یہ اخلاق سوز کاروبار عین حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا ہے اور وہ مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھنے کی بجائے انہیں اس سے بہرہ مند کرنے پر مصر ہے۔

تیسرے پانچسالہ منصوبے کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں اُن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری حکومت اضافہ آبادی کو ایک خطرناک روگ سمجھ کر اس کے تدارک کے لیے سب سے زیادہ فکر مند ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے اس نے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی ہے اور ساٹھ ہزار کارکنوں کی فوج ظفر موج کو میدانِ عمل میں اتارنے کا پروگرام بنایا ہے۔ معلوم نہیں کس شیطان نے ہمارے ملک کے اربابِ بست و کشاد کے کانوں میں یہ بات پھونک دی ہے کہ

کثرتِ آبادی ہر لحاظ سے کسی ملک کے لیے ایک تشویشناک علامت ہے اور اس کے روکنے سے اُس کے سارے معاشی اور معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

ضبطِ تولید کوئی معاشی مسئلہ نہیں بلکہ یہ انسان کے جذبۂ ایثار، اس کے احساسِ عصمت و عفت اور اُس کی عزتِ نفس کے خلاف ایسی خوفناک سازش ہے جس نے انسانی عز و شرف کی ساری اقدار کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جب بھی کسی قوم کے اندر خود غرضی، مادی فوائد و لذائذ کی پرستش اور اخلاقی ذمہ داریوں سے بغاوت کے منفی رجحانات نے زور پکڑا، ان کے نتیجے میں ضبطِ تولید کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جس قوم نے بھی اس تحریک کو اپنایا اُسے قدرت نے دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ یہ سراسر ایک منفی تحریک ہے جس میں تعمیر کا کوئی پہلو مضمر نہیں، یہ انسان کے احساسِ شکست کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

آبادی کی کثرت کوئی خطرناک بیماری نہیں بلکہ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جسے قبول کرنے کی وجہ سے قوموں کے اندر حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے، اُن کے اندر زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا ولولہ بیدار ہوتا ہے تاریخ کے اوراق میں قوموں کے عروج و زوال کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ آبادی کی کثرت نے بسا اوقات بڑی بڑی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ مشہور مؤرخین، ابن خلدون، گبن اور ارنلڈ ٹائن بی نے یونان و روم کے زوال پر جو فاضلانہ بحثیں کی ہیں وہ اس بات کی پوری طرح تائید کرتی ہیں کہ جب کسی قوم نے آبادی کو روکنے کی کوشش کی تو اُس کی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ گئیں۔ ان دونوں قوموں نے جو غیر معمولی ترقی کی، اور اپنی معاصر اقوام پر اپنی برتری کا جو نقش بٹھایا وہ کسی لکھے پڑھے شخص سے پوشیدہ نہیں۔ آغاز میں آبادی کے اضافے نے ان اقوام کے اہلِ بصیرت کو دعوتِ فکر و عمل دی اور انہوں نے اس مسئلہ کو کامیابی سے حل کرنے کے لیے ایک ایسے نظامِ سیاست، نظامِ معیشت اور نظامِ

معاشرت کی تشکیل کی جو تعمیری نقطۂ نظر سے اپنے دور کے رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بہتر تھا لیکن مال و دولت کی فراوانی اور دنیاوی عیش و آرام کی غیر معمولی دلچسپی نے انہیں ایک طرف نہ صرف خدا سے یکسر مایوس اور غافل بنا دیا بلکہ ان کے بیمار ذہنوں نے ایسے دیوتاؤں کو اختراع کیا جن سے ان کے جذبۂ بے بسی اور بے چارگی کی تسکین ہوتی ہو اور جو ان کے ذہنی اضمحلال کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہوں۔ چنانچہ یونانی مذہب ایک طلسم ہوشربا ہے جس میں تخلیق کا کوئی پہلو نہیں۔ اس کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ یونان کے نزدیک "آسمانی خدا" اہلِ زمین کے معاملے سے بالکل بے تعلق ہو چکے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑے بے رحم تھے اور فطرت کے ہاتھوں اسی طرح بے بس تھے جس طرح انسان بے بس ہوتے ہیں۔ کارِ دنیا سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ انسانی مصائب و آلام کو دیکھ کر خندہ زن ہوتے اور انسانی محرومیوں کی داستانیں سن کر لطف اٹھاتے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئے جو ہر قسم کے اخلاقی احساس سے بیگانہ تھے اور انہوں نے یونان کے معاشی اور معاشرتی نظام کو خالص مفاد پرستی کی بنیاد پر استوار کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملک کی زمامِ کار ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں آگئی جس نے اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت کے لیے عوام کے اندر اس باطل خیال کی آبیاری شروع کی کہ حکومت کرنے کا حق ایک مخصوص گروہ کو ہے جو ذہنی اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ معاشرہ بڑے ہولناک نتائج سے دوچار تھا لیکن یہ برسرِ اقتدار طبقہ ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے اپنے معیارِ زندگی کو بڑھانے اور ذہنی عیاشیوں میں منہمک تھا۔ اس طبقہ نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے اور اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ضبطِ تولید کا پرچار شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگی اور ارد گرد کی جفاکش قوموں نے انہیں نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

یونان و روم کی طرح مغرب بھی اب ایک [illegible] منزل پر آگیا ہے جہاں سے وہ [illegible] عملاً مبتلا

ظاہر ہو رہی ہیں جو کسی تہذیب کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہوتی ہیں۔ ابتدا میں آبادی کے دباؤ نے اہلِ مغرب کو پیدائشِ دولت کے نئے نئے طریقے دریافت کرنے پر مجبور کیا اور انہوں نے صنعتی ایجادات میں حیرت انگیز ترقی کر کے آبادی کے اس چیلنج کو بڑی کامیابی کے ساتھ قبول کیا۔ اسی کی بدولت اہلِ یورپ دیکھتے دیکھتے پوری دنیا پر چھا گئے۔ مگر بدقسمتی سے وہ اپنی دنیاوی قوت و طاقت اور اخلاق کے مابین توازن قائم نہ کر سکے اور مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس نے انہیں اخلاقی اور روحانی اقدار سے یکسر غافل کر کے خالصتہً دنیا پرست بنا دیا۔ اس باطل طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی ترقی یک رُخی ہو گئی اور انہوں نے مادّی فوائد و لذائذ کے حصول کو ہی اپنا مقصود و مطلوب قرار دیا۔ اِس سے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو شدید نقصان پہنچا اور اُن کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مالک الملک کے عطا کردہ رزق کے اتھاہ خزانوں اور خداداد فکر و عمل کی خداداد قوتوں پر انہیں کوئی اعتماد باقی نہ رہا۔ انہوں نے اسی مادی زندگی کو منتہائے مقصود سمجھ کر جب غور کرنا شروع کیا تو مستقبل انتہائی تاریک نظر آیا۔ اخلاقی اصول و ضوابط سے تغافل نے اُن کے لیے زندگی کی عجیب و غریب پیچیدگیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ چنانچہ مادّی لذت ہی میں انہوں نے سکون تلاش کرنے کی کوشش کی اور ہر اُس اقدام کی مخالفت کی جس سے اس میں کسی کمی کا خطرہ نظر آتا ہو۔ اس کا پہلا ہدف اولادِ دینی اور انہوں نے ایک باطل فلسفے کے ذریعہ دنیا کی اس بزم میں نئے شرکاء کا راستہ روکنے کی پوری جد و جہد کی۔

جس مادّی نظریۂ حیات پر انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کر رکھی ہے اس کے لیے ضبطِ تولید بڑا مفید اور کارآمد نسخہ ہے۔ اس سے انسان معاشرتی ذمہ داریوں سے یکسر آزاد ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ دنیاوی لذآت سے متمتع ہو سکتا ہے۔ زنا [illegible]ت نے جو قدغن لگا رکھی ہے خاندانی منصوبہ بندی سے وہ ختم ہو جاتی ہے اور انسان پو[illegible] کے ساتھ دادِ عیش دے سکتا ہے۔

ابنِ خلدون نے قوموں کے زوال کا جو تجزیہ کیا ہے اُس کے مطابق اگر مغربی ممالک کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی بربادی کے سارے آثار سامنے آجاتے ہیں۔ انگلستان اس وقت جس صورتِ حال سے دوچار ہے وہ تہذیبی نقطۂ نظر سے انتہائی سنگین ہے۔ انگریز قوم جو کبھی بڑی محنتی اور جفاکش خیال کی جاتی تھی وہ اب انتہائی عیش پرست بن گئی ہے اور اہلِ یونان کے غلاموں کی طرح اُن کے سارے کاروبار کو مشرق سے آئے ہوئے محنت کش چلا رہے ہیں جس قوم کی معیشت کا پورا دارومدار دوسری قوموں پر ہو وہ آخر اسے ایک لمبی مدت تک کس طرح سنبھال سکتی ہے۔ قریب قریب یہی حال یورپ کی دوسری قوموں کا بھی ہے۔ وہ سب اپنی دولت و ثروت کے باوجود اپنی معاشی زندگی کے استحکام کے لیے مشرقی مزدوروں کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ چونکہ اضافہ آبادی اُن کے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں رہا، اس لیے اُن کی جدوجہد دن بدن کمزور پڑتی جارہی ہے اور اُن کے اندر تعمیر و ترقی کا وہ ولولہ ختم ہوتا نظر آتا ہے جس سے انہوں نے اپنی تہذیب کا آغاز کیا تھا۔ ضبطِ تولید کی تحریک جب ایک مرتبہ عوام میں مقبول ہو جائے تو پھر آبادی کے انحطاط کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ انفرادی زندگی کی آسائشیں انسان کو قومی ضروریات سے بالکل غافل بنا دیتی ہیں اور پھر انسان کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ اجتماعی مصالح کی خاطر کسی بڑے خاندان کا بوجھ اٹھانے کی ہمت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یونان اور روم کی طرح اہلِ یورپ بھی تعیشات کی فراہمی میں غیر معمولی ہنرمندی کا مظاہرہ کریں گے لیکن تعداد کے اعتبار سے کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے نظام کے قیام کے لیے مشرقی قوموں کے محتاج ہونگے۔ اس وقت تو ان اقوام کے محنت کشوں کی حیثیت کوئی زیادہ اہم نظر نہیں آتی اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ مغربی اقوام ان سے جس وقت چاہیں بے نیاز ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کے اندر جس سرعت کے ساتھ کاہلی اور سستی پیدا ہو رہی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرق سے آئے ہوئے مزدور، کمزور ہونے کے باوجود مغربی صنعتوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل کرلیں گے اور اس طرح اُن کا نظامِ معیشت اور معاشرت مزید کمزور ہو جائے گا۔

یونان، روم اور یورپ میں ضبطِ تولید کی تحریک ایک باطل طرزِ فکر اور مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات کی وجہ سے شروع ہوئی اور یہ اُس ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر کافی حد تک مقبول بھی ہو گئی۔ اس نے اہلِ مغرب کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ سمٹ سمٹا کر کچھ دیر اور زندہ رہنے کا انتظام کر سکیں۔ لیکن ہمیں اُس بدنصیب قوم کے اندازِ فکر پر سخت حیرت ہوتی ہے جو اللہ اور اُس کی رحمتوں پر یقین رکھتی ہے، جس کے نزدیک اخلاق، عفت اور پاکدامنی حیات انسانی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے، جو دنیاوی لذتیں سمیٹنے کے لیے زندہ نہیں بلکہ آخرت میں فلاح و کامرانی کے حصول کے لیے اس دنیا میں جدوجہد کرتی ہے، جسے قدم قدم پر ایثار کا درس دیا گیا ہے، جسے بنیادی طور پر یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ رزق کی ساری کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور انسان کو ایک مقرر پیمانے کے مطابق وسائل رزق فراہم کیے جاتے ہیں، جس نے آج سے چودہ سو برس پیشتر اضافہ آبادی کے چیلنج کو حیرت انگیز کامیابی سے قبول کیا اور اُس وقت کے انسانوں کو جو بھوک و افلاس کے خوف سے قتلِ اولاد کے مرتکب ہوتے تھے بڑی صراحت اور تاکید کے ساتھ کہا "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں، اور انہیں بھی (جنہیں تم بھوک کی وجہ سے قتل کرنے کے درپے ہو)۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ضبطِ تولید کی تحریک کسی معاشی مسئلہ کے حل کی کوئی مؤثر تدبیر نہیں، بالکل ایک باطل نظامِ فکر کی ایک کڑی ہے۔ اِس تحریک سے الحاد اور کفر کو تقویت پہنچتی ہے، اس سے خاندانی نظام کی جڑیں متزلزل ہوتی ہیں اور معاشرتی زندگی ایثار و تعاون کے جذبہ پر استوار ہونے کے بجائے خود غرضی کی شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تحریک اخلاقی اقدار کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف چند لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھتا ہے تو دوسری طرف پوری قوم کی تخلیقی قوتیں مضمحل ہوتی ہیں اور جلد ہی وہ نقطۂ انحراف آجاتا ہے جہاں اقوام آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی بجائے کارگہ حیات میں مسلسل پسپا ہونے لگتی ہیں اور سمٹتے سمٹتے اس حد تک کمزور پڑ جاتی ہیں کہ اُن کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ جس قوم کے افراد وقت کے چیلنج کو قبول

کرنے اور اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو اٹھانے سے اعراض کریں ان کے بقا کا آخر دنیا کی کونسی قوت انتظام کر سکتی ہے۔

ہمیں اُن لوگوں کی عقل پر ماتم کرنا چاہیے جو ان سب حقائق سے آنکھیں بند کر کے پاکستان میں ضبطِ تولید کی تحریک کو کامیاب بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ کیا اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ آج بھی قوموں کے لیے عددی قوت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستان چاروں طرف سے ایسے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے جو تعداد کے اعتبار سے اس سے کئی گنا زیادہ ہیں اور جو کسی وقت بھی اس کے لیے عظیم خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اس ملک میں آبادی کا اضافہ کوئی خدشہ نہیں بلکہ ملکی استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بشرطیکہ قدرت کی اس نعمت سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ ایک چیلنج ہے جسے اگر مردانگی سے قبول کیا جائے تو اس سے ایک صحت مند نظامِ حیات معرضِ وجود میں آسکتا ہے جو اتحاد، تعاون اور معاشرتی انصاف کی بنیادوں پر استوار ہو۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسا تعمیری اور صبر آزما کام ہے جو قوم اور اس کے اربابِ اختیار سے قربانی کا طالب ہے، اس لیے اس کے مقابلے میں تعمیری طرزِ فکر اختیار کرنے کے بجائے اُس طرزِ عمل کا پرچار کیا جارہا ہے جو بربادی کی طرف لے جانے والا ہے، جسے دنیا کی قوموں نے اس وقت اختیار کیا جب اُن کی ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئیں۔ اس ملک میں یہ تحریک ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے مال و جان کا زبردست زیاں کرنا ہوگا اور یہاں یہ اسی وقت کامیاب ہو سکے گی جب یہاں کی عظیم اکثریت خدا اور اس کے رسول سے مُنہ موڑ لے۔

وہ لوگ جو اس ملک میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کا عزم رکھتے ہیں اُن کے افکار و نظریات کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ وہ اس تحریک (باقی ص ۶۲ پر)